احمدالدین کے اصول تفسیر کا تنقیدی جائزہ

Critical analysis of Ahmaduddin's principles for explanaiton of the Holy Quran

ڈاکٹر محمد ایاز[i] ڈاکٹر سہیل انور[ii]

Abstract

Tafseer is a scicne which translates and explains the meanings of the Holy Quran. As Quran is the perfect & last message of ALLAH almighty to the whole mankind, therefore to practice it and solve the human problems of all the times, it is the responsiblity of the religious scholars to explain the meanings of the Holy Quran from time to time.

Since the emergence of Islam till date, Muslim Scholars have been taking this responsibility. They made Quran easily understandable for the commons by writing explanations (Tafaseer) of the Holy Quran to the best of their knowledge. Religious scholars in Sub Continent also contributed a lot in this important field and this skill / science is quite old in Sub Continent.

In this regard all the relevant scholars, whether Arab or Non Arab, strictly observed those principles, rules and regulations, which were considered obligatory and agreed upon among the eminent Muslim scholars. But during the British empire in Sub Continent, some modernists and rationalist emerged and they wrote translation and explanation of the Holy Quran in their unique style. They chalked out their own principles for explanation of the Holy Quran, which were quite different, almost contrary to those, which were agreed upon among the Muslim scholars since long. Sir Syed Ahmad Khan laid the foundation of this school of thought imperceptibly. Khwaja Ahmaduddin also belongs to the same school, who followed Sir Syed very cautiously. He wrote an Urdus Tafseer (explanation) of the Holy Quran

i اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک تھیالوجی، اسلامیہ کالج، پشاور

ii لیکچرار، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز، عبدالولی خان یونیورسٹی مردان

in seven volumes which created mental disturbance and restlessness among the Muslims of sub continent, and resultantly a new debate and discussion took place. The given research article critically analyses his principles for explaining the Holy Quran, in the light of those principles which have been agreed upon among Muslim scholars.

***Key Words**:*

خواجہ احمد الدین کے اصول تفسیر کا تنقیدی جائزہ

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری انسانیت کے نام آخری اور مکمل پیغام ہے اور انسانیت سے اس پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا مطالبہ ہے۔ لہذا اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے تاکہ کسی کو نہ سمجھنے یا عمل نہ کرنے کا بہانہ نہ مل سکے۔ ہر دور میں قرآن کے معنی و مفہوم کو عوام کیلئے قابل فہم بنانے کیلئے علماء کرام اور مفسرین نے مختلف زبانون میں تراجم و تفاسیر لکھیں۔ برصغیر کے علماء بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے اور عالم اسلام کے متفقہ اور مسلمہ اصول تفسیر کی روشنی میں عربی، اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں تفاسیر لکھیں۔ البتہ انگریز کے دور استعمار میں برصغیر میں عقلیت پسند اور Rationalist مکتبہ فکر نے جنم لیا جنہوں نے مسلمان علماء کے متفقہ و مسلمہ اصول تفسیر سے ہٹ کر قرآن کی تفاسیر لکھیں۔ سرسید احمد خان غیر اعلانیہ طور پر اس فکر کے بانی ہیں۔

آپ سے متاثر افراد میں ایک نام احمد الدین امرتسری کا بھی ہے۔ پورا نام خواجہ احمد الدین امرتسری بن خواجہ میاں محمد بن محمد ابراہیم ہے۔ ۱۸۶۱ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، انہیں عربی فارسی، اردو اور انگریزی میں مہارت حاصل تھی۔ حجیت حدیث کے منکر اور نیچری ہیں ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے[1]۔

تفسیر "بیان للناس" خواجہ احمد الدین امرتسری نے بیسوی صدی میں لکھی ہے۔ اُردو زبان میں لکھی گئی یہ تفسیر سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک منزل کو الگ الگ کتابی شکل میں چھاپ کر الگ جلد کی حیثیت دی گئی ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اُردو دان طبقے کا خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ آیات کی تفسیر کرتے وقت بعض مقامات پر قرآن ہی کی دیگر آیات اور زیادہ تر اپنی ذاتی عقل و رائے ہی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی

موصوف کی تفسیر جمہور مفسرین سے فکری اختلاف کی بناء پر منفرد ہے۔ اور اول تا آخر اس میں عقائد، عبادات اور معاملات وغیرہ سے متعلق احکام کے حوالے سے امت کے اجتماعی طرزِ فکر کی مخالفت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا مقالہ ہذا میں جمہور مسلم مفسرین کے مسلمہ اُصول تفسیر کی روشنی میں خواجہ احمد الدین امرتسری کے اُصولِ تفسیر پر بحث کی جاتی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں کہ جو کوئی قرآن پاک کی تفسیر کرنا چاہے وہ اوّلاً اس کی تفسیر خود قرآن پاک ہی میں تلاش کرے کیونکہ (بعض اوقات) ایک مقام میں ایک بات کو اجمال سے ذکر کیا جاتا ہے جب کہ قران پاک ہی کے کسی دوسرے مقام میں اس کی تفسیر و تفصیل مذکورہ ہوتی ہے اور ایک جگہ میں اختصار ہوتا ہے جب کہ دوسری جگہ میں اس بات کو بسط کے ساتھ ذکر کیا گیا ہوتا ہے۔ اگر کسی آیت کی تفسیر قران کریم میں نہ ملے تو پھر سنت میں اس کی تلاش کرے کیونکہ سنت قرآن پاک کی شارح اور اس کی وضاحت کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انّا اَنْزَلْنَا اِلَیکَ الکتابَ بِالْحَقِ لِتَحْکُمَ بینَ النّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللہ[2]

"بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف کتاب حق کے ساتھ اُتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو (اس آیت کے علاوہ دوسری آیتوں میں) سمجھایا۔"

اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے اجتہاد ہیں جو غیر کتابی وحی کی ایک قسم ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَہ مَعَہ[3] "آگاہ رہو کہ میں قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کا مثل دیا گیا ہوں۔"

اس سے غیر کتابی وحی کی دیگر صورتیں مراد ہیں۔ اگر آیت کی تفسیر کو سنت میں نہ پائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں اس لئے کہ قرآن کے نزول کے وقت کے تمام قرائن اور حالات کا انہوں نے مشاہدہ کیا اور اس لئے بھی کہ قرآن پاک کے فہم تام اور علم صحیح اور اس پر نیکی کے ساتھ عمل میں ان کو خصوصیت حاصل ہے۔ جب کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کے اقوال میں تعارض معلوم ہو تو اگر ان سب کو ایک مشترک معنی میں جمع کیا جاسکتا ہو تو ایسا ہی کریں گے مثلاً الصراط المستقیم کے بارے

میں صحابہ سے جو مختلف اقوال ملتے ہیں مثلاً یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے اور انبیاء کا طریقہ ہے اور سنت کا طریقہ ہے اور نبی ﷺ کا طریقہ ہے اور حضرت ابو بکرؓ کا طریقہ اور حضرت عمرؓ کا طریقہ ہے تو ان تمام اقوال کا ایک ہی معنی نکلتا ہے یعنی راہِ ہدایت۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے اور ایک کو اختیار کرنا گویا سب کو اختیار کرنا ہے لہٰذا کسی قول کو بھی اختیار کرنا درست ہے۔ اور اگر صحابہ کے اقوال میں ایسا تعارض ہو کہ ان کو جمع نہ کیا جاسکے تو پھر ان میں سے ایسے قول کو لیا جائے گا جس کی کسی نقلی دلیل سے تائید ہوتی ہو۔ اگر نقلی دلیل نہ ہو تو جس قول کی دلیل زیادہ قوی ہو گی اس کو ترجیح دی جائے گی اور اگر مراد کو معلوم کرنے کے دلائل میں بھی تعارض ہو تو اب سمجھیں گے کہ تفسیر کرنے والے پر مراد مشتبہ ہو گئی لہٰذا اس لفظ قرآنی سے جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے' اس پر ایمان رکھے گا البتہ اس مراد کی تعیین میں زبردستی نہ کرے اور اس لفظ کو تفصیل حاصل ہونے تک مجمل اور بیان حاصل ہونے تک متشابہ سمجھے[4]۔

خواجہ احمد الدین کے اُصولِ تفسیر

خواجہ احمد الدین امرتسری تفسیر کے سلسلے میں مذکورہ بالا اُصول کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ اس کا طریقہ کار اسلاف سے بالکل مختلف ہے۔ موصوف کا ایک مداح صوفی غلام مصطفی تبسم تفسیر بیان للناس کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> "عوام قرآنِ پاک کے سادہ طریق استدلال اور فطری اسلوبِ بیان سے اس قدر ناآشنا ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی آواز بلند کرے کہ یہ تعلیماتِ ایزدی وصفی علوم کی تمام پیچیدگیوں سے منزہ اور خارجی مؤثرات سے بے نیاز ہو کر بھی اپنے اندر ایک حسن، ایک عظمت رکھتی ہیں، تو دقّت پسند طبائع اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکیں گی۔ قرآن پاک کو سمجھنے اور اس کی حقیقی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کیلئے لازمی ہے کہ ہم ان تمام پردوں کو یکسر دور کر دیں جو ہمارے اسلاف کی کم نگاہیوں کے باعث اس پر پڑ چکے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعلان بہت بڑی جرأت ہے۔ ہمارے زمانے میں سب سے پہلے یہ جرأت مولوی چراغ علی، سرسید، مولانا غلام علی رحمہم اللہ اور ان کے بعض تلامیذ کی طرف سے ظاہر ہوئی۔۔۔۔۔۔ پیش نظر تفسیر (بیان للناس) کو مذکورہ الصدر مساعی کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے۔ اس میں آپ کو بہت سے نکات ایسے نظر آئیں گے جو نقش اوّل میں قطعاً نہیں اور اگر ہیں تو اس وضاحت سے نہیں۔

خواجہ احمد الدین قرآن کو صرف قرآن سے سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں کہ:

1. زید "علیہ السلام نے کیا سمجھا اور" بکر "رضی اللہ عنہ نے کیا فرمایا۔

2. وہ لغات عرب اور کارِ گاہِ فطرت کے سوا کسی اسناد اور استشہاد کے نیاز مند نہیں معلوم ہوتے۔
3. انہوں نے قرآن مجید کی آیات، رکوعات اور سُوَر کے باہمی ربط کو نہایت خوش اسلوبی سے واضح کیا [5]۔"

اس کے علاوہ تفسیر "بیان للناس" کے تمہید سے پہلے "سر آغاز" کے عنوان کے تحت موصوف کے ایک اور معتقد محمد حسین عرشی امر تسری لکھتے ہیں:

"اس تفسیر میں پانچ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں:

1. اس کے مخاطب بلالحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔
2. اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقلِ سلیم کے خلاف نہ ہو۔
3. ترجمہ میں سب سے پہلے اُصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔
4. اس کے بعد عام منشائے قرآن کو تتبع ہے، جو محکمات سے واضح ہے۔
5. اس کے ساتھ صفت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے [6]۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں احمد الدین امر تسری کے اُصول تفسیر کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ سر سید احمد خان کے اُصول تفسیر کو بیان کیا جائے جو کہ اسی طرز پر تفسیر کرنے والوں کے پیش رو گزرے ہیں۔ سر سید نے خود اصول تفسیر وضع کئے تھے۔ اور عقل کی بنیاد پر تفسیر لکھنے والے زیادہ تر انہی اصول کے خوشہ چین رہے ہیں۔ مثلاً سر سید احمد خان نے اُصول تفسیر سے پہلے بطور تمہید لکھا ہے کہ "*Work of God*" یعنی خدا کے کام اور "*Word of God*" یعنی (خدا کا کلام) یعنی قرآن مجید کبھی مختلف نہیں ہوسکتے۔ اگر مختلف ہوئے تو *Work of God* تو موجود ہے، جس سے انکار نہیں ہو سکتا، اس لئے جسے *Word of God* کہا جاتا ہے "اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دونوں میں اتحاد ہو۔ سر سید کے دیگر اصول تفسیر درج ذیل ہیں۔

1. تمام صفات باری ابدی ہیں ان صفات کی نہ کوئی حد ہے، اور نہ انتہاء لیکن اس نے اپنی دانائی اور اختیار کلی سے قوانین قدرت تخلیق کیے اور انہیں تخلیق اور وجود کے نظم وضبط کیلئے قائم رکھتا ہے۔
2. قرآن پاک میں کوئی امر بھی قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے۔

3. نسخ جو متن اور تفسیر میں مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے اسے مکالمہ قرآن کے سلسلہ میں رد کرنا ضروری ہے۔
4. قرآنی مسائل معاد، مسائل متعلقہ بہ ملائکہ، عفریتیات اور کونیات سائنسی حقیقت کے متضاد نہیں ہوسکتے، اور اسی کی زبان میں ان کی تشریح ہونی چاہیے۔ گویا سرسید احمد خان کے خیال میں سائنس مظاہر فطرت کی تشریح کرتی ہے، فطرت فعل خدا ہے اور قرآن قول خدا ہے۔ اور اللہ کے فعل اور قول میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا سائنس اور قرآن میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآن کی تشریح کے لئے بھی معیار سائنس کو ہی ہونا چاہیے۔
5. قرآن شریف کے بالواسطہ یا بلا واسطہ بیانات، جو انسانی معاشرت کی ترقی کے امکانات، اور اضافہ کا باعث ہوسکتے ہیں کے مطالعہ کیلئے لسانی تحقیق بھی ضروری ہے[7]۔"

چنانچہ کارِ گاہِ فطرت یعنی نیچر کو خدائی منصب پر فائز کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اپنی تصنیف میں معجزات و خوارقِ عادت کا صریح منکر نظر آتا ہے اور ان میں من مانی تاویلات کرکے آیاتِ قرآنی کا حلیہ بگاڑنے کی مذموم کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ جہاں تک لغاتِ عرب سے استناد کا تعلق ہے تو وہ صرف وہاں پر اختیار کرتا ہے جہاں پر اس کے نظریات کے مفید مطلب کی کوئی سوچ ثابت ہوتی ہو ورنہ ہر مقام پر اس کا استحصاء نظر نہیں آتا۔

خواجہ احمد الدین امرتسری اور اس کے پیش روؤں، مولوی چراغ علی، سر سید احمد خان اور مولوی غلام علی قصوری جیسے لوگوں کی بنیادی کمزوری یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے فطرت اور نیچر کو کائنات کا خدا سمجھ لیا ہے اور جو چیز فطرت کے خلاف نظر آتی ہے، جھٹ سے ان کا انکار کردیتے ہیں۔ چنانچہ فطرت کو حاکم مان لینا اور یہ یقین کرلینا کہ اس کائنات میں کبھی بھی کوئی واقعہ فطرت کے خلاف رونما نہیں ہوسکتا ہے اور اس کائنات میں فطرت کا قانون علت و معلول اور سبب و مسبب اٹل اور لاینفک ہے' اس کو اللہ تعالیٰ کے دستِ تصرف سے بھی بالاتر سمجھنے کی وجہ سے خوارق عادت اُمور جو قرآن کریم میں مختلف انبیاء کرامؑ کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے اظہار کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں، انکار لازم آجاتا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات نہ تو صریح انکار کرسکتے ہیں اور نہ اقرار۔ اسلئے ان خوارقِ عادت اُمور کی ایسی تاویل کرجاتے ہیں کہ جس سے وہ اُمور خوارق نہیں

بلکہ معمول کی چیزیں بن جاتی ہیں لیکن یہاں پر بڑا اہم سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر یہ امور اسی طرح معمول کے کاروائی تھے تو پھر ان کو قرآن میں کسی نبی کی حقانیت کے طور پر دلیل یا اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے طور پر ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بہر حال احمد الدین بھی نیچر کا اسیر اور خوارقِ عادت کا منکر ہے۔ "بیان للناس" میں جابجا اس کی تصریح پائی جاتی ہے۔ بطور سند چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

"لوگ چاہتے ہیں کہ ان قواعد کو جو حکیمانہ طور پر بنائے گئے ہیں توڑ دیں اور ان کی جگہ خوارق پیدا کر کے دکھلائیں۔ ایسے خوارق احسن تقویم، فطرت اللہ اور غیر مبدل سنن الٰہیہ کے بر خلاف ہونگے اور خوارق کے ماننے سے کبھی وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کی لوگ تمنا کرتے آرہے ہیں۔ اگر عصائے موسیٰ فطرت کے بر خلاف سچ مچ سانپ بن جاتا تھا تو پہلے فرعون کو ہی ایمان لانے پر مجبور ہونا چاہیے تھا پھر اس کی قوم ہی مخالفت سے باز آجاتی[8]۔"

اسی اصول کے تحت قرآن کریم کے تمام خوارق عادت امور کو وہ یکسر انکار کی نذر کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے سمندر میں خشک راستے کو وہ خرقِ عادت کے طور پر نہیں مانتا۔ اس ضمن میں لکھتا ہے:

"اس وقت جھیل منسل اور بحیرہ روم کے درمیان ایک فراخ راستہ موجود تھا۔ مصر و عرب کے مسافر اسی راستہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام جب فرعون سے بھاگ کر مدین میں گئے تو ان کے لئے یہی راستہ تھا اور جب وہ وادی ایمن سے مصر میں داخل ہوئے تو اسی راستہ سے ہی واپس آئے۔ ہاں جب بحیرہ روم چڑھاؤ پر ہوتا تھا اور شمالی ہوائیں جنوب کے راستے چلا کرتی تھیں تو بحیرہ روم پھیل کر جھیل منسل اور نیل کی دوسری شاخ سے جاملتا تھا اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دونوں سفروں میں اسی راستہ کو بغور دیکھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس وقت انہیں فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے سمندر میں جو ایک خشک راستہ ہے اپنا عصاء مار کر اس کا پتہ لگادے۔۔۔۔۔۔ سونٹے کو مار کر خشک راستہ کا پتہ لگانا مقصود تھا یہ بات نہ تھی کہ سونٹے کو مارنے سے راستہ کو خشک بنادیا جائے[9]۔"

اگر بات صرف یہی تھی جس کو خواجہ احمد الدین باور کرانا چاہتا ہے تو اس کو قرآن بیان کر کے کیا درسِ عبرت دینا چاہتا ہے؟ اس طرح تو ہر ایک انسان پانی کی گزر گاہوں سے باآسانی گزر سکتا ہے۔ کیا قرآن ایک تاریخی کتاب ہے جو چند افراد کی تاریخ بیان کرتا ہے اور ان کے قصے سنا کر گذشتہ واقعات ازبر کراتا ہے؟ یقیناً نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو بیان کر کے

اس کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کی اس کو حاصل شدہ مدد و نصرت کو بیان کرتا ہے کہ وہ کیسے اپنے دوستوں کو بلا اسباب بچاتا اور دشمنوں کو غرق کرتا ہے اور اپنی قدرت کے مظاہر کا نظارہ دکھاتا ہے۔

لیکن موصوف کو اپنی بات پر اصرار ہے اور کہتا ہے کہ فرعون نے اپنی فوج غلط راستہ پر لگادی اور دریا میں اس وقت سیلاب کی کیفیت تھی اس لئے وہ غرق ہوگئے۔ یعنی فرعونیوں کا غرق ہونا عذابِ الٰہی نہ تھا بلکہ فرعون کے غلط راستے کے انتخاب کا نتیجہ تھا ورنہ وہ غرق ہونے سے بچ سکتا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ ڈال دیا اور صحیح راستے پر نہ ڈالا فرعون اپنے لشکروں سمیت جھیل منسل کے کنارے پر نیل کی دوسری شاخ میں غرق ہو گیا[10]۔"

قرآن سے ثابت ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تھا، اور بنی اسرائیل نے جب سامنے دریا دیکھا تو ڈر کے مارے کہنے لگے کہ ہم تو پکڑے گئے' اس لئے کہ آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر ہیں۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ فرعونی بنی اسرائیل کے تعاقب میں عین اُن کے پیچھے جا رہے تھے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اُسی راستے پر گیا تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ڈالا تھا۔ لہٰذا موصوف کا یہ کہنا بالکل بے معنی اور نصِ قرآنی کے خلاف ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ ڈال دیا اور صحیح راستے پر نہ ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس خصوصیت سے نوازا تھا کہ جب وہ زبور کو پڑھتے تھے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِيْنَ[11]

"اور ہم نے داود علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی۔ اور تھے ہم ہی (یہ سب) کرنے والے۔"

لیکن موصوف اس کو فطرت کے خلاف سمجھتا ہے کہ پہاڑ یا پرندے کلام کریں لہٰذا وہ پہاڑوں سے مراد پہاڑوں کے باشندے اور "طیر" سے مراد مزعومہ قبیلہ مراد لیتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

"آیت بالا میں جبال سے مراد اہل جبال ہیں۔ ان جبال میں عمالقہ قوم رہتی تھی جس کو بنی اسرائیل جبارین کہتے تھے وہ پہاڑوں کے رہنے والے جن تھے۔ داؤد علیہ السلام نے ان پر فتح حاصل کی اور انہیں

قابو میں لائے۔ وہ دن بھر داؤد علیہ السلام کے ساتھ کام کرتے تھے پچھلے پہر اور دن چڑھے داؤد علیہ السلام کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے [12]۔"

سوال یہ ہے کہ اگر بات ایسی تھی جیسا کہ موصوف کہتا ہے تو اس میں کونسی بڑی بات تھی کہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کے باشندے اور قبیلہ طیر کے لوگ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔

نیز طیر کے متعلق لکھتا ہے:

"شام میں ایک شہر ہے جسے طیر (Tyre) کہتے ہیں۔ وہاں طیر قوم بستی تھی۔۔۔۔۔۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے جاسوسوں کو طائر ہی کہتے تھے [13]۔"

اسی طرح قرآن کریم میں آیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ہدہد پرندے نے باتیں کیں اور ملکہ بلقیس کی بادشاہت اور اس کی قوم کی مشرکانہ رسوم کی خبر دی تھی۔ لیکن موصوف کو یہ بات چونکہ اپنی مزعومہ طیر کے خلاف معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ اس کا انکار کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہدہد ایک انسان تھا جو جاسوسوں کا آفیسر تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے:

"ہدہد ایک صاحب اختیار انسان تھا۔ مختلف جرموں کے سبب اس کو مختلف سزائیں بھی دی جاسکتی تھی۔ معقول دلیل لانے پر اس کو ان سزاؤں سے رہائی بھی مل سکتی تھی، وہ ضروری سمجھ کر خود ہی اپنی جاسوسی کی خدمت پر گیا ہوا تھا اور ملکہ بلقیس اور اس کی قوم کے ضروری حالات دیکھ کر آیا اور ایسی یقینی خبر لایا کہ جس کا پتہ حضرت سلیمانؑ کو بھی نہ تھا [14]۔"

"بیان للناس "سے چند مزید اقتباسات بطور مثال پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ مزید وضاحت ہو جائیگی کہ موصوف سر سید احمد خان کے وضع کردہ اُصول تفسیر کی پیروی کرتا ہے اور کس طرح اپنے ذاتی عقل کو پہلے سے طے شدہ فکر فاسد اور طے شدہ اُصول تفسیر کی طرف موڑ دیتا ہے، خواہ اس کیلئے کتنی ہی دور از کار اور بعید از عقل تاویلیں کرنی پڑیں:

1. نتیجہ یہ کہ رسول کریم ﷺ میں کوئی بات بھی حد بشریت سے بڑھ کر نہ تھی، بلاشبہ قرآن کریم بشریت کی حد سے بڑھ کر ہے۔ یہ قرآن مجید خدا کی طرف سے ہے نہ کہ رسولؐ کی طرف سے، پس رسول کریم کو ایسا اختیار دینا جس سے ان کی اپنی حدیثیں بھی خدا تعالیٰ کے قرآن کی

مثل بن جائیں، قطعاً باطل ہے۔ جب بات یہ ہے تو حدیثیں صرف بر بناء قرآن و عقل ہی لی جاسکتی ہیں اور بس[15]۔"

حالانکہ سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کی وہی تفسیر معتبر و مستند ہو گی جو کہ نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے۔ اس لئے کہ قرآن آپؐ پر ہی نازل ہوئی اور اس کی توضیح و تبیین بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمے لگائی ہے قرآن میں ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [16]

لیکن موصوف قرآن کی تفسیر کرنے میں آپ ﷺ کی قولی و فعلی تبیین و توضیح کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح موصوف تفسیر کے میدان میں صحابہ و تابعین اور اپنی سمجھ و عقل کو یکساں تصور کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس میدان میں ان کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یا ایھا الناس کا خطاب مکی سورتوں میں آتا ہے۔ مدنی سورتوں میں نہیں آتا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ سورت (البقرہ) ابتدائی مدنی سورت ہے اس میں یا ایھا الناس کے الفاظ بصراحت تمام آئے ہیں۔ پھر سورۃ النساء اور سورۃ حج کے شروع میں بھی یہی الفاظ برابر موجود ہیں۔ یہ سورتیں بھی مدنی ہیں۔ یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ ان میں جنگ کا ذکر وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مفسرین کی ایسی غلطیوں سے صاف کھل جاتا ہے کہ تمام مفسرین خواہ صحابہ ہوں یا تابعین، جو تفسیر وہ اپنی سمجھ سے کرتے تھے، اس میں وہ ہمارے جیسے آدمی تھے۔ وہ ایسی فاش غلطیوں سے بھی بری نہ تھے۔ ہمیں ان سے معقول فوائد حاصل کرنے ضروری ہیں لیکن کسی بشر کی غلطی کی پیروی ہر گز ہر گز نہ کرنا چاہیے۔ غلطی جہاں بھی ہو غلطی ہے۔ غلطیوں سے پاک صرف ایک ذات ہے جو ہمارا خدا ہے اور بس[17]۔"

موصوف کا یہ دعویٰ بالکل بے تکا ہے اس لئے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی پر اساتذہ، ماحول اور زمانے کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اب قرآن صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اترا وہ قرآن کے اولین براہ راست مخاطب تھے۔ اس کے اسباب نزول سے واقف تھے بلکہ اکثر انہی کے اعمال اور استفسار پر اللہ تعالیٰ نے احکام کا نزول فرمایا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے

صحبت یافتہ اور براہ راست شاگرد تھے۔ انہوں نے الٰہی تعلیمات کو نبی کریم ﷺ سے قولاً و فعلاً دونوں طرح سے لیا۔ مزید یہ کہ وہ اہل زبان بھی تھے لہذا پہلے تو وہ اپنی سمجھ سے تفسیر کرتے نہیں تھے بلکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث و سنت کی تحقیق کرتے اور جہاں قرآن و سنت کے بعد اپنی سمجھ کا استعمال ناگزیر ہوتا تو اس کا استعمال بھی قرآن و سنت ہی کی روشنی میں کرتے تاکہ ان کی سمجھ اور نصوص میں تصادم نہ آئے۔ اور اس معاملے میں وہ انتہائی محتاط رہتے تھے۔ انھیں دین کو اپنی اصلی شکل میں پیش کرنے کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ اس کی تائید حضرت علیؓ کے اس قول سے ہوتی ہے آپؓ نے فرمایا:

"جب میں تم سے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بیان کروں تو سمجھو کہ آسمان سے گرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ پر جھوٹ باندھنے سے[18]۔"

اور یہ سب کچھ نبی کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح تابعین نے انہی تربیت یافتہ صحابہ کرام سے علم لیا۔ لہذا تفسیر کے میدان میں ان کی سمجھ اور اپنی سمجھ کو ہم پلہ قرار دینا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ لہٰذا حدیث، اقوال صحابہ اور دیگر اسلاف سے آزاد ہو کر محض اپنی عقل کے بل بوتے پر کلام الٰہی کی تفسیر کرنے میں موصوف کہاں سے کہاں چلے جاتے ہیں، چنانچہ بنی اسرائیل پر کوہ طور کے بلند کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

2. کوہِ طور ایک آتش خیز پہاڑ تھا لیکن وہ اس وقت سرد ہو کر بجھا پڑا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں وہ خوب زور و شور پر تھا اور عملی طور پر وقتاً فوقتاً اپنی جوش و خروش دکھاتا تھا۔ بنی اسرائیل نے پہاڑ کے نیچے ڈیرے ڈالے تھے۔ پہاڑ ان کے سر کے اوپر بلند تھا۔ پہاڑ میں اس وقت زلزلے آرہے تھے اور وہ اس طرح جھک کر ان کے سروں کے اوپر آتا تھا گویا وہ سائبان تھا اور انہیں ہر دم اس کے اُن پر آگرنے کا خدشہ لاحق تھا۔ سخت زلزلہ کے وقت بعض اوقات پہاڑ اپنی بنیادوں سے ہل کر زمین کے اوپر ابھر آتا اور پہلے کی نسبت زیادہ اونچا ہو جاتا ہے۔ زلزلے کے ہچکولوں سے پہاڑ کے پتھر اُڑ کر سروں کے اوپر سے گزر جاتے ہیں ایسے خوفناک وقت کا عہد قابل یاداشت ہے۔ ایسے واقعات سے خدا تعالیٰ کے جلال اور

مؤاخذہ کا نقشہ مدتوں سامنے رہ سکتا ہے مگر انہوں نے جلدی ہی اسی عہد کو پس پشت ڈال دیا[19]۔"

3. اسی طرح نافرمانوں کے صور تاًبندر بننے کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

كُونُوْا قِرَدَةً خَاسِئِين[20] یہ اس قسم کی بات ہے جیسے ایک استاد اپنے لاپرواہ اور کند ذہن شاگرد کی تعلیم میں ہر طرح کوشش کر کے ناکام ہو کر یہ کہہ دے کہ "جا گدھا بن[21]۔" اور یہ سب کچھ اس لئے کہ موصوف تفسیر کرتے وقت حدیث کو خاطر میں نہیں لاتے، اور نہ ہی اسے وحی اور حجت مانتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"لوگ ظنی باتوں کو وحی بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ شیطانی تعلیم ہے، اس سے بچو، اسی کو ما انزل اللہ سمجھو جس کا انزل اللہ ہونا ثابت ہے، روشن وحی اور عقل ہی دلیل ہیں[22]۔"

لہٰذا احدیث کو چھوڑ کر محض اپنے عقل کو دلیل بنا کر تفسیر کرنے کا انجام درج ذیل عبارت سے ملاحظہ ہو:

"ہمارے کعبے میں ایک کالے پتھر کے چومنے کا تعامل چلا آتا ہے لیکن قرآن مجید فرماتا ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّور[23]معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں یہ پتھر توڑ کر کوڑے پر پھینکا گیا تھا لیکن لوگوں نے اسے جوڑ جاڑ کر دوبارہ نصب کر لیا[24]۔"

بقول سر سید قرآن پاک میں کوئی امر بھی قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ لہٰذا احمد الدین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ یہ قانونِ فطرت نہیں ہے۔ درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

4. الغرض (مریم کے اہل میں یہ نکاح ہو گیا اور) اس نے اس بچے کو پیٹ میں لیا پھر (جب لوگوں کی طرف سے ناقابلِ برداشت مصیبتیں پائیں تو) وہ اس بشرسوی کے ساتھ کسی دور جگہ میں الگ ہو گئی[25]۔"

5. سر سید احمد خان کے اُصول تفسیر کے مطابق موصوف عفریتیات، کونیات وغیرہ کی تشریح سائنس کی زبان میں کرتا ہے۔ درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

"غیب بینی کے مدعی اور جادو گر اور کراماتی پیر اور کاہن اور قدامت پسند ملّانے اور پنڈت اور جوتشی اور پوپ ہمیشہ خلقت کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو پاک اور پوتر سمجھتے ہیں انسانوں میں یہی لوگ ہیں جنہیں "جِنّ" کہا جاتا ہے[26]۔"

6. اسی طرح موصوف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ یدِبیضاء کو عقل کے کوزے میں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"کوہِ طور کا دہانہ جنوب رویہ تھا۔ طور کی دائیں یا مغربی وادی میں طور کے صدموں سے بجلی پیدا ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی جوتیاں اتار دے۔ بجلی کے سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام یدِبیضا کی طرح چمکتے تھے، اُس وادی میں اعصابی امراض والے دوسرے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن "شاہدین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے[27]۔"

نسخ سے متعلق خواجہ صاحب کا موقف

موصوف قرآن میں نسخ کا قائل بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"لوگ اسلام کے خلاف ہمیشہ یہ جاہلانہ پروپیگنڈہ کرتے آئے ہیں کہ اسلام احکامِ الٰہی کو منسوخ کرتا آیا ہے، وہ اسلام جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں بھی تھا اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا اور دین طلب کرے گا تو وہ اس سے کبھی قبول نہیں ہو گا اور آخرت میں وہی شخص گھاٹے والا ہے، کیا وہی اسلام الٰہی حکموں کو منسوخ کر سکتا ہے؟ جب اسلام شروع دنیا سے چلا آیا ہے تو کیا وہ بعد کے مذاہب کا ناسخ بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں[28]۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"وحی کا نور اور وحی والی زندگی کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ نور کی ناسخ ظلمت ہو گی اور زندگی کی ناسخ موت بنے گی اور حق کی ناسخ ضلالت ہی ٹھہرے گی۔ جو چیز منسوخ ہوتی ہے وہ سزائی احکام ہوتے ہیں اور جن خوبی والے احکام کو لوگوں نے جہالت اور شرارت سے بھلا دیا ہوتا ہے ان کی جگہ ویسے ہی خوبی والے احکام لائے جاتے ہیں[29]۔"

اجماع کے بارے میں خواجہ صاحب کا نظریہ

اسی طرح موصوف اجماع کے بھی منکر ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ الانعام رکوع ۱۴، آیت ۶ کا ترجمہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"لوگ اصلی سمجھ کی باتوں کیلئے بھی عام خلقت کا اجماع ڈھونڈتے، اس لئے ارشاد ہے) اور اگر تو بہت لوگوں کی جو اس زمین (کے مادی عالم) میں ہیں پیروی کرے تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ سوائے ظن کے (یعنی ظنی حدیثوں اور روایتوں کے) کسی اور بات کی پیروی نہیں کرتے۔ اور نہیں ہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑاتے[30]۔"

نیز دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"باقی رہا اجماع کا مستند ہونا تو دین کے لحاظ سے اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللهِ[31] سبیل المؤمنین سے مراد وہ رستہ ہے جو مومن شوریٰ سے قائم کرتے ہیں جیسا کہ اس کی مقدم آیت سے ثابت ہے[32]۔"

شانِ نزول سے متعلق موصوف کا مؤقف

موصوف شانِ نزول کو بالکل نہیں مانتے، حالانکہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں اس کی اہمیت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسباب نزول کا علم تفسیر قرآن کیلئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسباب نزول جاننے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں اور کیوں نازل فرمایا۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَقْرَبُواْ الصَّلاَةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى[33] "اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو۔"

اگر شانِ نزول کی روایات سامنے نہ ہوں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب شراب از روئے قرآن بالکل حرام ہے تو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، اس سوال کا جواب صرف شانِ نزول ہی سے مل سکتا ہے، چنانچہ اس کے سبب نزول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کچھ صحابہؓ کو کھانے پر مدعو کیا، وہاں کھانے کے بعد شراب پی گئی، اس حالت میں نماز کا وقت آگیا، تو ایک صحابیؓ نے امامت کی، اس میں نشے کی وجہ سے قرآنی آیات کی تلاوت میں غلطی کر گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[34]۔

لیکن موصوف قرآن کی تفسیر کرتے وقت شان نزول کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس لئے کہ اسباب نزول معلوم کرنے کیلئے احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جس کو موصوف حجت تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں قرآن کریم بذاتِ خود اتناواضح ہے کہ اس کی تشریح کیلئے اسباب نزول کو جاننے کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا تفسیر کرتے وقت موصوف، شان نزول سے مدد نہ لینے کی وجہ سے اصل موضوع سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور گاہے گاہے محض اپنی عقل سے سبب نزول بیان کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر موصوف کی بیان کردہ تفسیر جمہور مفسرین سے اور علوم اسلام کے Main stream سے ہٹ جاتی ہے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

1. سورۂ کہف آیات ۲۳، ۲۴ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اصحاب کہف کا ارادہ تھا کہ سردست ہم اس غار میں پناہ لیں گے پھر موقع پا کر کہیں دور بھاگ جائیں گے۔ کوئی انسان غیب دان نہیں ہے کہ کل کیا کرے گا، اس لئے رسول مقبول کو بھی نصیحت کی جیسا کہ ارشاد ہے) اور تُو کسی شے کے متعلق مت کہہ کہ میں اسے کل کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ چاہے (انسان بیماری و موت یا کسی اور مصیبت سے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ انسان ایسا وعدہ تو کر سکتا ہے کہ میں اپنی طاقت کے مطابق اس کام کو ضرور بجالاؤں گا لیکن ہر قدرتی رکاوٹ کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ضرور ہے کہ اپنی عاجزی کو دکھلانے کیلئے انشاء اللہ بھی کہے) اور جب تو بھول جائے تو اپنے رب کو (اُس وقت ہی) یاد کر لیا کر (جیسا کہ اصحاب کہف نے بے ہوشی کی حالت میں خدا تعالیٰ کو بھلا دیا تھا تو بھی انسان ہے تیرے لئے بھی ویسی ہی مجبوریاں ہیں۔ تجھ پر کوئی کام تیری طاقت سے بڑھ کر نہیں ڈالا جاسکتا۔ یادِ الٰہی کو بھلا دینا انسان کی کمزوری کا ظاہر کرتا ہے۔ اس کے اس فعل کو وحی نہیں بتایا جاسکتا۔ انشاء اللہ کہنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول کی ہر بات وحی نہیں ہوتی) اور (یہ بھی) کہہ قریب ہے کہ میرا ربّ مجھ کو ایسی بات کی راہنمائی کرے جو ہدایت (و کامیابی) میں اس سے زیادہ قریب ہو۔ (اصحاب کہف کو غار میں بڑی تکلیف پہنچی اور انہوں نے واجبی کامیابی دیکھی، اس جگہ رسول کریم کو امیدوار کیا گیا ہے کہ تجھے غار کے بعد زیادہ ہدایت اور کامیابی ملے گی) [35]۔"

2. سورۃ الفتح آیت ۱۰ کے تحت لکھتا ہے:

"تحقیق وہ لوگ جو تجھ سے بیعت (یعنی عہد) کرتے ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ (اپنے معبود حقیقی یعنی) اللہ (کامل، مطلق) سے بیعت (عہد) کرتے ہیں (یعنی رسول ﷺ اپنی ذات کیلئے بیعت نہیں لیتے، خدا

ہی کیلئے لیتے ہیں کہ وہ اس کے حکم کی پوری اطاعت کریں گے۔ اس لحاظ سے) اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پس جس نے عہد توڑا (مومن ہو یا کافر ہو، کوئی بھی ہو) پس سوائے اس کے نہیں کہ اپنی جان پر عہد توڑا (اس کا خمیازہ بھگتے گا، کیونکہ عہد شکنی بہت بڑا گناہ ہے) اور جس نے اسی بات کو، جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا ہے پورا کیا، تو جلد ہی اللہ اس کو (ایفائے عہد کے انعام میں) بہت بڑا اجر دے گا (جس طرح مومن کو مارنا سارے جہاں کو مارنے کے مترادف ہے ایسی ہی اس کافر کو بھی مار دینا سارے جہاں کو مار دینے کے برابر ہے، جو قاتل اور مفسد وغیرہ نہ ہو۔ حاملہ عورت جو مطلقہ ہے اگر حمل کو اپنے خاوند سے بتا کر نہیں جاتی، تو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر نہیں ہے[36]۔"

کہیں کہیں اندازِ تفسیر ایسا ہے کہ موصوف اپنی طرف سے بلا دلیل شان نزول بیان کرتے ہیں جو جمہور مفسرین کے یکسر خلاف ہوتا ہے۔ چند ایک مثالیں درج ذیل سطور میں ملاحظہ ہوں: سورۃ الحجرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اب حجرات کا تعلق الفتح، اس کے ترجمہ و تشریح سے واضح ہو گا۔ جس سے نظم و ربط صاف نظر آجائے گا۔ مکہ فتح ہو گیا ہے، مکہ اور مدینہ کے درمیان وسطی حصہ پر رسول کریم ﷺ کا تسلط ہو چکا ہے اور دور دور سے وفود آکر حضور ﷺ کی خدمت میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں۔ عرب کے ارد گرد اکثر چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، وہ اسلام قبول کر کے بھی بعض دفعہ آپس میں لڑتی تھیں۔ ان کی معمولی جنگ کو ایک فاسق نے بڑی رنگ آمیزی سے بیان کر کے بعض تیز طبع صحابہؓ کو بھڑکا دیا اور وہ رسول کریم کو گھر سے پکارنے گئے اور آواز دینا شروع کی کہ حضور ﷺ باہر تشریف لائیں گویا ایک دہائی سی مچادی۔ نہ یہ معلوم ہے کہ آپ ﷺ کس حجرہ میں تشریف فرما ہیں، نہ اس کا انتظار ہے کہ حضور ﷺ خود باہر تشریف فرما ہوں تو عرض کریں گے، نہ وحی کا انتظار کیا کہ خدا احکم دے گا اور نہ خود ہی اس بے بنیاد خبر کی پوری جانچ پڑتال کی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جب آپ ﷺ باہر آتے، تو ادب سے آپ ﷺ کے گوش گذار کرتے۔ پھر جیسا آپ ﷺ فرماتے، اس پر عمل کرتے، لیکن انہوں نے نہ رائے پوچھی، نہ مشورہ کیا، بلکہ چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ جب آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو ان لوگوں نے فوراً اپنی طرف سے تجویز پیش کر دی کہ یہ کرنا چاہیے، وہ کرنا چاہیے وغیرہ۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پہلے آپ ﷺ کی بات سُن لیتے پھر بعد میں کچھ عرض کرتے۔ اس سورۃ میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ وہ رسول کریم ﷺ کی عزت و احترام کو ملحوظ رکھا کریں، اور حضور ﷺ کی موجودگی میں نہایت ادب کے ساتھ گفتگو کیا کریں[37]۔"

- سورۃ الحجرات آیات ۵، ٦ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ایک فتنہ پرداز شخص، جو کاذب اور فاسق تھا جب کوئی موقع آتا، چالاکی سے کام لیکر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتا اور سادہ مسلمانوں کو بھڑکا کر ان سے لغزش کرا دیتا اور فتنہ میں ڈال دیتا تھا۔ فرمایا' آئندہ ایسے لوگوں سے احتراز کرو)۔ اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے (اچھی ہو یا بُری، جلد بازی نہ کرو، بلکہ مجلس شوریٰ قائم کر کے تمام پہلوؤں پر سوچ بچار کر لیا کرو) پس تحقیق کر لیا کرو (یہ مشہور فاسق، بڑا فتنہ پرداز اور غیر بادشاہوں کا پروپیگنڈہ کرنے والا تھا۔ اسی لئے منع فرمایا کہ اچھی طرح خبروں کی تحقیق کر لیا کرو، مبادا بلا غور و فکر کسی پر حملہ کر کے غلطی کا شکار ہو جاؤ اور بعد میں شرمندگی اُٹھانی پڑے[38]۔"

سوال یہ ہے کہ وہ فتنہ پرداز شخص کون تھا؟ اس نے کونسی چھوٹی حکومتوں کے مابین لڑائی کو رنگ آمیزی سے بیان کیا، اور کون سے صحابہؓ اس سے بھڑک اٹھے؟ موصوف اس کی نشاندہی کرنے سے خاموش ہیں۔ لہذا یہ محض اپنی عقلی اختراع اور فرضی بات معلوم ہوتی ہے۔

- سورۃ الجمعہ کے "مضمون اور نظم و ربط" کے تحت لکھتے ہیں:

"اس سورت کے اخیر میں ذکر ہے کہ یوم الجمعہ میں جب لوگ ذکر الٰہی کیلئے اکٹھے تھے مسجد کے پاس تاجروں کا ایک قافلہ آیا اور کھیل و تماشہ ہونے لگا۔ اُس وقت نمازی رسولِ خدا کو کھڑا چھوڑ کر تجارت اور تماشہ کی طرف چلے گئے۔ رسول خدا نے تاجروں اور تماشہ والوں کو ممکن ہے کہ الگ سمجھایا ہو۔ لیکن آیات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں اپنے لوگوں کو ایسا کرنے سے روکا۔ جیسا کہ اس سورت میں بھی آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مسجد کے پاس کوئی جلوس یا باجہ گذر رہا ہو تو ہمیں اس کے ساتھ اُلجھ کر اپنی وعظ و نصیحت کو اپنی نماز کو خراب نہ کرنا چاہیے۔ یہ لوگ بیع کو چھوڑ کر آئے تھے لیکن مسجد میں آکر تجارت اور لہو کی طرف جھک پڑے۔ شروع انتظام میں ایک دفعہ ایسا معاملہ پیش آیا لیکن آخر ٹھیک ہو گئے[39]۔"

- سورۃ المنافقون "مضمون اور نظم و ربط" کے تحت لکھتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی ادائیگی کے وقت جبکہ تاجروں کا قافلہ آیا اور انہوں نے لوگوں کو مائل کرنے کیلئے باجہ بجایا تو منافقوں نے سچے مومنوں کو سمجھایا کہ اس قحط کے وقت میں ہم کو تجارت کی زیادہ ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ غلہ جلدی ختم ہو جائے اور ہم خالی رہ جائیں۔ اس وقت صحابہ کی کثرت رائے ہو گئی۔ رسول کریم ﷺ نے ہارون علیہ السلام کی طرح موقع پہچان کر اختلاف ڈالنا نہیں چاہا۔ اگر حضور انہیں روک دیتے تو کیا ممکن تھا کہ سچے صحابہ ہی آنجناب کو کھڑا چھوڑ کر چلے جاتے۔ جب واقعہ ہو چکا اور (وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْواً انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِماً[40] کی آیت نازل ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ[41] تو حکم الٰہی کے بعد نہ حضور کی

موقع شناسی ہی ٹک سکتی ہے اور نہ مومنوں کی کثرت رائے ہی کام دے سکتی ہے۔ اُس وقت صفائی کے ساتھ قرآن کی پیروی ہی مومنوں کیلئے لازم ہے[42]۔"

سوال یہ ہے کہ کہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی ادائیگی کے وقت تاجروں کا قافلہ آیا۔ نیز جمعہ کی ادائیگی سے کیا مراد ہے؟ اس لئے کہ موصوف تو "جمعہ" کی اصطلاح ہفتہ کے کسی خاص دن یا خاص نماز کے لئے استعمال نہیں کرتے، بلکہ وہ جمعہ کو اکٹھ کا دن کہتے ہیں۔

- سورۃ المعارج آیت ۳۶ کے ذیل میں لکھتا ہے:

"جب کافروں نے سنا کہ اولٓئیک فی جنّٰت مکرمون یعنی مومنوں کی جنّات میں عزت کی جاتی ہے تو ٹولیوں میں رسول کریم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ جب مومنوں کو جنت میں عزت ملتی ہے اور وہ ہمارے بھائی ہیں تو ہمیں اُمید ہے کہ آپ لوگ جو مومن ہیں اپنی عزت کے سبب ہمیں بھی جنت میں لے جائیں گے۔ اس کا جواب دینے کیلئے فرمایا) پھر کافروں کو (جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں) کیا ہو گا کہ وہ تیری طرف سر اُٹھائے دوڑے چلے آتے ہیں[43]۔"

- سورۃ المزمل کے "مضمون اور نظم و ربط" کے تحت لکھتے ہیں:

"فرض نمازوں کیلئے حکم ہے کہ اگر ان کا وقت پر ادا کرنا مشکل ہو تو رات کی نمازیں دن میں اور دن کی رات میں پڑھی جاسکتی ہیں لیکن رات کی تہائی اور دو تہائی پر عمل کرنا محال ہے۔ تم بھی دوسرے ملکوں میں تجارت کیلئے جاتے ہو یا جائز جنگوں پر جانے کی ضرورت ہوئی تم خود وہاں اسے کس طرح سے نباہ سکو گے۔ سو خدا نے تم پر مہربانی سے رجوع کیا یعنی تمہاری غلطی کو معاف کیا سو جتنا قرآن بسہولت پڑھا جائے اسی قدر پڑھ لو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات پہلی آیت کے مفہوم میں غلطی ہو جانے کے سبب سے کی جاتی تھی[44]۔"

- سورۃ المدثر کے "مضمون اور نظم و ربط" کے تحت لکھتے ہیں:

"عوام الناس کا خیال ہے کہ وحی الٰہی کی شدت رسول کریم پر اس قدر ہوئی کہ حضور کانپنے لگے اور گھر میں آکر کپڑا اوڑھ لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ رسول مقبول پر وحی کا اتنا دباؤ پڑتا تھا کہ آنجناب کے ماتھے پر پسینہ آجاتا تھا اور اونٹنی بھی حضور کے بوجھ کو بمشکل برداشت کرتی تھی۔ اور اگر وحی کے وقت پر آنسرورؐ کا سر کسی کی ران پر رکھا ہوتا تھا تو اس کا سر مبارک کا اتنا بوجھ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ میری ران ٹوٹنے کے قریب ہے۔ یہ سب باتیں عوام الناس کے خیال کی پیدائش ہیں۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جس رات میں رسول مقبول کو خدائے تبارک و تعالیٰ کی طرف سے شرف وحی حاصل ہوا تو وہ رات بڑی قدر والی تھی۔ وہ رات صبح تک سلامتی ہی سلامتی تھی۔ اس وحی کی

لذت ساری رات رہی۔ جب کچھ دنوں کے لئے وحی بند ہو گئی تو رسول کریم بہت حیران و پریشان تھے۔ کافر طعنہ دیتے تھے کہ اس کے ربّ نے اسے چھوڑ دیا اور اسے دشمن قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ جب دوبارہ وحی کرتا ہے تو کافروں کے طعن کی تردید فرماتا اور ارشاد کرتا ہے کہ تجھے زیادہ اور زیادہ خیر ملتی جائیگی۔ خدا تعالیٰ کے رسول وحی کے انتظار میں چلّہ کشی کرتے اور روزے رکھتے تھے۔ وہ وحی سے کانپتے ہوئے گھر میں آکر کپڑے نہیں اوڑھ لیا کرتے تھے[45]۔"

اپنی طرف سے شانِ نزول کی چند مزید مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جن کی سند کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف نے یہ کہاں سے لیا ہے؟

- سورۃ البروج کی آیت ۴ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آگے ایک تاریخی شہادت ہے۔ کفار نے موحد عیسائیوں کو دکھ دینے کا منصوبہ کیا تھا۔ یہ واقعہ اس ملک میں خوب شہرت رکھتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے) تباہ کئے گئے خندق والے[46]۔"

- سورۃ الضحیٰ کے "مضمون اور نظم و ربط" کے تحت لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ بہت دنوں کے لئے وحی الٰہی کا آنا رک گیا۔ کافر کہنے لگے کہ اس کے ربّ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے ناراض ہو گیا۔ وحی کے اس رُک جانے سے مقصود یہ تھا کہ رسول کریم کے دل میں زیادہ شوق اور طلب پیدا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرے لئے ہر پچھلی حالت پہلی سے اچھی ہو گی۔ اور اسے دن اور رات کی مثال سے واضح کیا کہ جس طرح رات کے سکون سے آگے کو زیادہ ترقی کیلئے رستہ کھل جاتا ہے وہی حالت یہاں ہے[47]۔"

- سورۃ العلق کے "مضمون اور نظم و ربط" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"پہلی سورت میں کافر و فاسق کے دلیل بننے کا ذکر ہے اس کا نمونہ اسی سورت میں مکہ کے دارالندوہ کے ایک شریر رئیس کی صورت میں دکھلایا گیا ہے۔ رسول کریم امن والے مکہ کی مسجد میں نماز اور قرآن پڑھتے تھے۔ اس نے آکر قرآن پڑھنے سے سختی سے روکا۔ آپ غم ناک ہو کر گھر میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم عنقریب ہی تجھے اس کی شرارت سے نجات دیں گے تو اس کا کہنا مان اور قرآن پڑھ[48]۔"

- سورۃ الفیل کا عجیب و غریب شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سورت میں ایک ظالم بادشاہ کا ذکر ہے جو قریش کے امن کو مٹانا اور مسجد الحرام سے ذکر الٰہی کو روکنا چاہتا تھا اور اس لئے اس نے حملہ کر دیا تھا۔ ان کے راستہ میں ایک ایسا درہ واقع تھا جو اس کے خاص حصوں میں سخت وبا کا موجب بن جاتا تھا۔ جب اس کا لشکر اس درہ میں آیا تو ان پر ایسی وباء آئی جس سے وہ مرنے کیلئے لیٹ گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے اور نوچنے کیلئے پہاڑی گدھیں بکثرت بھیجیں۔ وہ ان پر

پتھر پھینکتے تھے تاکہ ان میں زندگی کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ پھر انہیں کھا جاتے تھے اور انہیں بھُس کی طرح بنادیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نمونہ سے ظلم کی بندی کو ظاہر کیا اور بتلایا کہ جب ظالم سزا پانے کیلئے اسی دنیا میں تیار ہوتا ہے تو عاقبت کی سزا تو اور سخت اور قابل عبرت ہوگی [49]۔"

سوال یہ ہے کہ اگر یہ خدائی عذاب نہیں تھا، بلکہ وبا تھی تو اس کا شکار صرف ابرہہ کا لشکر ہی کیوں ہوا؟ کیا اُس وقت مکہ معظمہ اور گردونواح لوگوں سے بالکل خالی تھا؟

موصوف سورت کے آغاز میں پچھلے سورت کے ساتھ اس کا ربط بیان کرتے ہیں۔ جن جن امور میں گذشتہ اور موجودہ زیر بحث سورت مربوط ہوتے ہیں، اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ عموماً تشریح اور وضاحت پہلے ہوتی ہے اس کے بعد ایک رکوع اور آخر میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ لیکن پوری تفسیر میں ترجمہ کا انداز بھی یہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت قوسین لگا کر مضمون کو غیر ضروری طول دیتے ہیں۔ زیادہ مقامات پر یہ بین القوسین طول بے محل، غیر متعلقہ اور اُکتا دینے والا معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر تفسیر کا انداز یہ ہے کہ اپنی فکر کو بنیاد بنا کر آیات کو اس کی طرف موڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً انکارِ حجیت حدیث، اقوال صحابہؓ کو حجت نہ ماننا، خدا کے کام (فطرت) اور خدا کے کلام (قرآن) میں مطابقت سمجھانے کی کوشش، معجزات و کرامات کا انکار یا ان کو عقلی جامہ پہنانا اور بلا دلیل و بے محل اپنی عقلی اختراع کو ٹھونسنا وغیرہ۔ بطور سند چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1. جیسا کہ ہم نے تم میں سے ایک ایسا رسول (عالمگیر تعلیم دے کر) بھیجا ہے جو تم پر (اپنی نہیں بلکہ) ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور (اس قرآن کے ساتھ) تمہیں پاک کرتا اور (صرف اسی قرآن کو سُنا کر) تمہیں (تمام انبیاء کی) کتابیں اور (تمام حکماء کی) حکمتیں سکھاتا ہے اور علاوہ بر آں (اسی قرآن میں) تمہیں اور بھی ایسی باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ پس (اس شاندار اصلاح کی بنا پر) تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور (ایسی اعلیٰ تعلیم پر) میرا شکر کرو اور میری بے قدری نہ کرو[50]۔
2. آیت الکرسی (البقرہ: ۲۵۴) کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ جو ہے تو اس کے سوا کوئی معبود نہیں (تمام مخلوقات نیچر کے اندر جکڑی ہوئی ہے۔ صاحب اختیار مخلوق کو مناسب ارتقاء پر نیچرل خوبیاں تو مل سکتی ہیں لیکن وہ خوبیاں جو فوق الفطرت متصرف خدا کے لائق ہیں۔ وہ صاحب اختیار انسانوں کو ہرگز ہرگز نہیں دی جاسکتیں۔ پس کسی صاحب اختیار کو جزءً یا کلاً بے

غلط بنانا اور اس کو ایسا ملکہ نبوت یا غیبی طاقت یا وہی قوت دینا جس سے اس کے معلومات ویسے ہی بن جائیں جیسے وحی کرنے والے خدا کے اور اسی طرح کسی صاحب اختیار انسان کو خدا تعالیٰ کی دوسری قدرتوں میں بھی جزءً وکلًا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملانا خواہ انہیں بالغیر ہی سمجھا جائے اُسے اِلٰہ بنانا ہے[51]۔"

3. سورۃ الانعام رکوع ۱۴ کی دوسری آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کیلئے انس و جن کے شیطانوں کو دشمن بنایا (اگر کسی نبی نے بھی ایسے خوارق کھلم کھلا دکھلائے ہوتے تو لوگ ان کے دشمن کیونکر بن سکتے تھے۔ کیا کسی کو جرأت ہو سکتی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے والے کی نوبت صلیب تک بھی پہنچا دے)۔ اُن (انس و جن) کا بعض بعض کو دھوکہ دینے کیلئے کلام کی ملمع کاریوں کا اشارہ کرتا ہے (اس دنیا کے تمام خوارق صرف ملمع کاری سے ہی بنائے ہوئے ہیں[52]۔"

4. سورۃ یونس آیت ۶۸ کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس یہ لوگ ایسے خدا کی اولاد بھی ٹھہراتے ہیں اور اس طرح خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارتے ہیں جیسا کہ فرمایا) انہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد پکڑی ہے۔ وہ پاک ہے۔ وہ اصل غنی ہے (اسے کسی غیر سے کوئی اثر و فائدہ لینے کی ضرورت نہیں) جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اسی کی ملک ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کیا تم اللہ پر وہ باتیں کہتے ہو جن کا علم نہیں رکھتے؟ (اپنے دل سے کہہ دینا کہ بخاری و مسلم قرآن میں داخل ہیں اور بندوں کو خدا پر حاکم بنانا ایسی سب باتیں اسی میں آجاتی ہیں[53]۔"

حالانکہ موصوف کی طرف سے بین القوسین وضاحت کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی مسلمان بخاری و مسلم کو قرآن میں داخل سمجھتے ہیں۔

قرآن کے مفہوم کو اپنے عقلی اختراع کے تابع کرنے کے دُھن میں موصوف بعض اوقات ایسا طرز اختیار کر لیتے ہیں جو کسی طرح بھی عقلِ سلیم کو اپیل نہیں کرتا۔ مثلاً اصحاب کہف کا تین سو نو سال تک بغیر کھائے پیئے غار میں زندہ سلائے رہنا چونکہ تعقل پسند طبائع کو ہضم نہیں ہوتا اس لئے موصوف اس واقعے کی دور از کار تاویلات کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بیان للناس کے درج ذیل عبارات ملاحظہ ہوں۔

5. سورۃ الکہف آیت ۱۱ کا ترجمہ تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مگر قصہ بانوں نے اسے کرامت کے رنگ میں رنگ لیا تھا جس پر ہمارے رسول کریم مدت تک تعجب کرتے رہے اور آخر گمان کر لیا کہ شاید یہ امر واقعی ہو اور خدا کی قدرت آیات سے ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے (قصہ تراشوں کے خیال کے مطابق) غار میں ان کے کانوں پر کئی سال تک تھپکی ماری (یعنی انہیں اسطرح سلایا جس طرح لوگ اپنے بچوں کے کانوں پر تھپکی لگا کر سلاتے ہیں، وہ جتنی دیر بھی سوئے رہے بآرام نہیں سوئے رہے، کروٹوں کے بدلنے سے ان کے بے چینی کا صاف اظہار ہوتا ہے[54]۔"

6. اگلی آیت (سورۃ الکہف: ۱۲) کے تحت لکھتے ہیں:

"پھر ہم نے (افسانہ نویسوں کے قول کے مطابق) انہیں جگا دیا تا کہ ہم دیکھیں (کہ قصہ گوؤں کی) دونوں جماعتوں میں سے کسی نے اس مدت کو یاد رکھا ہے جس قدر کہ وہ (وہاں) رہے۔ قصہ نویسوں کی بتلائی ہوئی دونوں روایتیں ہی غلط تھیں۔ وہاں اتنی مدت رہے جتنی دیر تک زندہ آدمی کھانے پینے کے بغیر جی سکتا ہے[55]۔"

7. الکہف آیت ۲۱ کے تحت لکھتے ہیں:

"اُس ظالم بادشاہ کو اس کے کسی عیسائی رشتہ دار نے قتل کر دیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس دنیا میں ایسے انقلابات ایک ہی دم میں واقع ہو سکتے ہیں۔ جب اس کھانا خریدنے والے نے عیسائی حکومت دیکھی تو خدا تعالیٰ کا شکریہ بجالایا۔ عیسائیوں کو معلوم ہوا کہ وہ غالباً اس غار میں گئے ہیں۔ اس غار میں جا کر کوئی بچ نہیں سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ مر گئے ہونگے۔ اس لئے انہوں نے کمیٹی کی۔ کچھ ان میں کہتے تھے کہ ہم ان کی یادگار میں یہاں عمارت بنائیں گے، اور جن کی رائے کو غلبہ ملا، انہوں نے کہا کہ ہم ان پر مسجد تعمیر کریں گے[56]۔"

حالانکہ موصوف کا مذکورہ بالا موقف کسی طرح بھی ان متعلقہ آیات کا صحیح مطلب واضح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس سے تو قاری ابہام و الجھاؤ کا شکار ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اصحاب کہف زہر کے سبب بے ہوش ہو گئے۔ اور زہر کا اثر ختم ہونے پر وہ ہوش میں آ گئے، اور یہ دورانیہ بقول موصوف اتنا ہی تھا جتنی دیر تک آدمی کھانے پینے کے بغیر زندہ جی سکتا ہے۔ تو ایسے لوگوں کی یادگار میں عمارت بنانے یا مسجد تعمیر کرنے کا کیا جواز ہے؟ موصوف یہ سب کچھ اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اس کے دماغ میں یہ بات نقش ہے کہ کائنات میں خلافِ فطرت کچھ واقع ہو نہیں سکتا اور تین سو نو سال تک غار میں بغیر کھائے پیے زندہ رہنا معمول کے واقعات کے خلاف ہے۔ لہذا تمام معجزات و خوارق کا یا تو انکار کرنا ہو گا یا ان کی عقلی توجیہ کرنی پڑے گی۔ اس سے موصوف کا یہ تصور واضح ہوتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا مظاہرہ کبھی نہیں کریں گے۔ گویا اس کی قدرت اس کی سنت کے پابند ہے۔ حالانکہ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے جو چاہے کر سکتے ہیں: مَا یُرِیْد[57] فَعَّال لِّما یُرِیْد[58] کرنے میں کسی مخلوق کے محتاج اور کسی ضابطے کے پابند نہیں ہے۔ وہ "الصمد" ہے۔ تمام مخلوقات اثر پیدا کرنے میں خالقِ حقیقی کے محتاج ہیں جبکہ خالق کسی کام کرنے میں کسی بھی مخلوق کا محتاج و پابند نہیں ہے۔ لہٰذا اصحاب کہف کو تین سو نو سال تک کھلائے بغیر زندہ رکھنا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی کام مشکل و ناممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لئے اصحاب کہف یا دیگر واقعات کی حقیقت کو تسلیم کرنا نہ کوئی مشکل ہے اور نہ ہی بعید از عقل ہے۔ ہاں البتہ موصوف کی طرح اپنے خود ساختہ اصول کو بنیاد بنا کر محض اپنے عقل کو مطمئن کرنے کی کوشش میں کلام الٰہی کے مفہوم کو بگاڑنا بہت بڑی جرأت ہے۔ جو کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس موقع پر موصوف اس آیت کا مصداق بن رہے ہیں۔ أَتَقُولُونَ عَلَى اللهِ مَا لاَ تَعْلَمُون[59] کیا اللہ تعالیٰ پر ایسی بات باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

8. سورۂ طٰہٰ آیت ۲۱ کے تحت لکھتے ہیں:

"خدا نے فرمایا تو اس (سونٹے) کو پکڑ لے اور (اس کی حرکت سے جو اس تنہائی کے وقت تجھے خائف بنا رہی ہے) مت ڈر۔ ہم بھی اُسے (جبکہ تو اسے اپنے ہاتھ میں پکڑیگا اور بجلی تیرے ہاتھ کے ڈالنے سے تیرے اندر جذب ہو جائیگی تو) اس کی پہلی (سکون کی) حالت پر لے آئیں گے[60]۔"

9. اسی سورۃ یعنی سورۂ طٰہٰ کی آیت ۲۲ کے تحت لکھتے ہیں:

"اور تو اپنے ہاتھ کو اپنے بازو کے ساتھ چمٹا تا کہ وہ (رگڑ کے سبب) بغیر کسی برائی کے روشن ہو کر نکلے (وہ رگڑ اس وقت پیدا ہو گی جب کہ تو اپنے ہاتھ کو گریبان سے کھینچ کر نکالے گا۔ یہ (تصرف الٰہی کی) ایک اور دلیل ہے[61]۔"

10. سورۂ لہب کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ابولہب کسی شخص نام نہیں ہے۔ ابولہب کے معنی ہیں شعلے کا باپ یعنی غصے سے بھرا ہوا مخالف۔۔۔۔۔ ابولہب صرف ایک شخص سے کنایہ ہے جو اسلام کا سخت دشمن تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنی کوششوں سے اور اپنا مال خرچ کر کے اس توحید کو مٹادوں گا۔ اور اس کی بیوی اس کے غصہ کی آگ پر تیل ڈالتی اور اس کے غصہ کو بھڑکانے کیلئے ایندھن اٹھا کر لاتی تھی یعنی جھوٹی روایتیں ادھر اُدھر سے لیکر آتی

تھی۔ اور اس کی آتشِ غضب کو دوبالا کر دیتی تھی۔ جس طرح اس کی بیوی جھوٹی روایتوں کا سلسلہ پروتی تھی اسی طرح آج جہنم میں اس کی گردن میں، جس میں وہ زیور ڈالتی تھی لوہے وغیرہ کی تاروں سے بٹی ہوئی رسّی پڑی ہوئی ہے۔"

الغرض اپنے اس مخصوص اور منفرد تفسیرِ قرآن کی وجہ سے خواجہ صاحب کی تفسیر بیان للناس علماء اور عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور نہ ہی موصوف کے اس مخصوص فکر کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ البتہ اہل قرآن مکتبہ فکر کے متعلقین کو بڑی حد تک فکری غذا اس تفسیر سے ملی، جس نے اپنے دور اور مابعد افراد کو اپنے اسی فکر پر برقرار رکھا۔ چوہدری غلام احمد پرویز اور اسی فکر کے دیگر معاصرین خواجہ صاحب کی اس فکر سے بہت متاثر ہوئے۔ جنہوں نے اسی فکر کو برصغیر پاک وہند میں کسی قدر منظم کیا۔

جمہور مفسرین کا عمومی انداز یہ رہا ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر کرتے وقت اوّلاً اس کی تفسیر خود قرآن پاک ہی میں تلاش کرتے ہیں کیونکہ بعض اوقات ایک مقام میں ایک بات کو اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے جب کہ کسی دوسرے مقام میں اس کی تفسیر و تفصیل مذکور ہوتی ہے۔ اگر کسی آیت کی تفسیر قرآن پاک میں نہ ملے تو پھر اس کی تلاش سنت نبوی ﷺ میں کرتے ہیں کیونکہ سنت قرآن پاک کی شارح اور اس کی وضاحت کرنے والی ہے۔

پھر اگر آیت کی تفسیر کو سنت میں نہ پائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ حضرات صحابہؓ قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے، نزولِ وحی کے اسباب سے واقف، نبی ﷺ کے براہِ راست شاگرد اور اہل زبان ہیں۔ اسی طرح مفسرین دورانِ تفسیر تابعین کے اقوال اور اجماع اُمت سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کرتے ہیں۔ نیز لغتِ عربی اور عقل سلیم کو بھی کام میں لاتے ہیں، بشرطیکہ شریعت مطہرہ سے متصادم نہ ہو۔

لیکن خواجہ احمد الدین امر تسری تفسیر کے سلسلے میں مذکورہ بالا اُصول کی قطعاً رعایت نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے موصوف کا طریقہ کار اسلاف سے بالکل مختلف ہے۔ اس امر کی نشاندہی خواجہ احمد الدین کی تفسیر "بیان للناس" کے تعارفی کلمات سے بھی ہوتی ہے :

"قرآن مجید کی بے شمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی لیکن ذرا تأمل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر، تفسیرِ قرآن ہونے کے بجائے کسی خاص فرقہ کی خیالات اور

معتقدات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے ائمہ داجلہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے[62]۔"

حالانکہ موصوف نے خود بھی سر سید احمد خان کے اُصول تفسیر سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ خواجہ احمد الدین کے معتقد جناب ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب امر تسری لکھتے ہیں:

"میری ناچیز رائے میں اُن کی دینی اور علمی سعی کا خاص امتیاز یہ تھا کہ اُنہوں نے قرآن کے مفہوم کو مشتبہ روایات کی مدد سے سمجھنے کی بجائے خود قرآن کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اور عجائب پرستی اور توہمات سے آزاد ہو کر قرآن کو عقلی اور فطری انداز میں سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا[63]۔"

مذکورہ بالا اقتباسات، صوفی غلام مصطفی تبسم و محمد حسین عرشی کے بیانات اور سر سید کے اُصول تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب افکار میں سر سید کے خوشہ چین ہیں اور قرآن کی تفسیر میں نہ اقوال رسول، فہم رسول یا تاویل رسول کو کوئی اہمیت دیتے ہیں اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کے اقوال کو خاطر میں لاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کو اگر رسول اکرم ﷺ کے بیانِ مراد سے مجرد کیا جائے گا کہ جن کی ذمہ داری تلاوت آیات اور تعلیم کتاب تھی تو پھر گمراہی کا در آنا قرینِ قیاس بلکہ لازم ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کو اپنے ماحول اور اولین مخاطبین کی تفہیم و تشریح سے الگ لیا جائے گا تو اس کی کوئی اصطلاح اور اس کا کوئی بھی حکم یا بیان حقیقت کو آشکارا نہیں کر سکے گا۔ خواجہ صاحب دوسرے مفسرین کی کاوشوں کو کسی خاص فرقہ کے خیالات و عقائد کی تفسیر تو کہتا ہے لیکن خود اس کا یہ حال ہے کہ قرآنی آیات کو اپنے پہلے سے اختیار کردہ فکر اور خود ساختہ اُصول تفسیر کی طرف موڑنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے خواہ اس کے لئے کتنی دور از کار تاویلات کا سہارا لینا پڑے یا عقل سلیم ہی کو خیر باد کہنا پڑے۔ بیان للناس سے ماخوذ مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں خواجہ صاحب کی تفسیر میں درج ذیل اُصول زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں:

1. تفسیر القرآن بالقرآن
2. تفسیر القرآن باللغۃ العربیہ
3. دورانِ تفسیر احادیث و روایات سے عدم اعتناء
4. اسباب نزول کا انکار
5. قرآن میں نسخ کا انکار

خواجہ صاحب کے صاحبزادے ضیاء اللہ آپ کا موقف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میں یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت خواجہ صاحب صرف قرآن مجید کو ہی الہامی کتاب سمجھتے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ قرآن مجید میں تمام وہ مسائل موجود ہیں جن کا وحی الٰہی کے ذریعے سکھایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ خود قرآن حمید اعلان کرتا ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ [64] اس لئے آپ کلام اللہ کو جمیع ضروریات وحی کے لئے کافی سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ اگرچہ حدیث نہ وحی ہے اور نہ حجّت لیکن پھر بھی اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے[65]۔"

خواجہ صاحب ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

"بڑا افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اکیلے قرآن کو کافی نہیں جانتے، وہ بخاری و مسلم کو بھی خود قرآن میں داخل کرتے ہیں اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ حدیثیں قرآن کی تفسیر ہیں۔ حالانکہ بہت سی حدیثوں کا قرآن کی تفسیر ہونے کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں بلکہ بہت سی حدیثیں قرآن حکیم کی تفسیر بننے کی بجائے قرآن کی تخریب کر رہی ہیں[66]۔"

نیز لکھا ہے:

"وحی کی تفصیل بھی خدا تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ یہ کسی انسان پر اس طرح نہیں چھوڑی جا سکتی کہ اس کا کہنا بھی بمنزلہ وحی یا عین وحی قرار دے دیا جائے۔ ہاں عقلی تشریح و تفصیل ہر جگہ سے لی جا سکتی ہے[67]۔"

لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ وحی کی لغوی تعریف یہ ہے:

الوحی الاشارة السریعة فی الخفیه[68] "وحی اس اشارہ کو کہتے ہیں جو سرعت کے ساتھ ہو اور پوشیدگی میں ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ وحی میں از روئے لغت تین باتیں ہونی چاہیئے:

1. **اشارہ / اختصار:** یعنی لمبی چیز کو مختصر طور پر ادا کرنا۔ یہ انگلی، ہاتھ، آنکھ یا سر کے اشارہ سے ہو سکتا ہے۔ گویا وحی ایک ایسا مختصر اشارہ ہوتا ہے جو تفصیل کی نشاندہی کرتا ہے۔ **اصطلاحِ شریعت میں وحی کی تعریف یہ ہے:**

كلام الله المنزل علی نبی من أنبیاءِ[69] "وحی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس کے نبی پر اُتارا گیا ہو۔"

بلاشبہ قرآن پاک دین و شریعت کی اصل اور اساس ہے اور ادلہ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے۔ مگر اس کا کام صرف اصول بتانا ہے۔ تفریع و تفصیل اور توضیح و تشریح حدیث و

سنت کا وظیفہ ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم اُمت کو رسول کے واسطے کے بغیر نہیں دیا گیا تھا کہ لو تم بذات خود یا اپنے ہی جیسے غیر نبی انسانوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو۔ بلکہ اس کے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیج کر ان پر قرآن نازل کیا گیا اور یہ صرف اس لئے کیا گیا تا کہ لوگ اپنے اپنے طور نہیں بلکہ صرف رسول اللہ ﷺ کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھیں، چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْکَ الذِّکْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَکَّرُون[70]

"اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب کو) تا کہ آپ کھول کھول کر بیان کر دیں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف اور تا کہ وہ غور وفکر کریں۔"

اس آیت کی رُو سے آپ ﷺ کا فرض ہے کہ اپنے قول یا عمل کے ذریعے سے قرآن میں جو بات مجمل ہے اس کی تفصیل کریں اور جو مبہم ہے اس کی وضاحت کریں۔ اور پھر قرآن ہی کے ذریعہ سے رسول ؐ کے فرائض اور ان کے منصب سے دنیا والوں کو آگاہ کیا گیا اور بار بار اعلان کیا گیا کہ یہی تم کو قرآن کے کلمات و حروف سنائیں اور یاد کرائیں گے اور یہی تم کو اس کے معانی و مطالب اور رموز و حکم بھی بتائیں گے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَيُزَکِّيهِمْ إِنَّکَ أَنتَ العَزِيْزُ الحَکِيْم[71]

"اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما، جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔"

ابن کثیر نے درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت و حدیث ہے[72]۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"تعلیم کتاب کا فریضہ آپ ﷺ کے فرائضِ نبوت ہی کا ایک جز اور آپ ﷺ کا معلّم ہونا آپ ﷺ کے منصبِ رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اسی وجہ سے اپنی حیثیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ لوگوں کو سکھایا اور بتایا اس کو آپ ﷺ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا ہی جاسکتا ہے۔ اب غور فرمایئے کہ اس تعلیم کے تقاضے کیا کیا ہوسکتے ہیں؟۔ اس کا بالکل ابتدائی تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن میں جو شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صیام، طواف،

عمرہ، نکاح، طلاق وغیرہ استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کی عملی شکلیں واضح نہیں کی گئی ہیں، ان کو آپ ﷺ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تا کہ لوگ عملی زندگی میں ان کو اختیار کر سکیں۔ (مزید لکھتے ہیں) اب غور کیجئے کہ یہ ساری باتیں تعلیم کے تقاضوں میں سے ہیں یا نہیں؟ اور آنحضرت ﷺ ان ساری چیزوں کی تعلیم کے لئے بحیثیت ایک اخلاقی معلم کے مامور تھے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے، تو غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اس حیثیت میں جو کچھ کہا اور کیا ہے اس کو آپ ﷺ کے فرائض نبوت کے دائرے سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ حدیث میں ان چیزوں کے سوا اور کیا ہے جو آنحضرت ﷺ نے بحیثیت معلّمِ کتاب و حکمت ہونے کے بتائی ہیں یا ان پر عمل کر کے دکھایا ہے[73]؟"

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ[74]

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں، اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب و حکمت اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"اور کتاب و حکمت یعنی قرآن و حدیث ہمیں سکھاتا ہے[75]۔"

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ[76]

"اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے اوپر جو نازل کی تھی تم پر یعنی کتاب اور حکمت، نصیحت کرتا ہے اللہ تم کو اس کے ساتھ۔"

محمد ادریس کاندھلوی اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تم کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو۔ اور اس کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تم پر کتاب اور حکمت کو اُتارا یعنی قرآن کریم اور سنت نبویؐ تم کو عطا کی تا کہ تم اپنے علم و عمل کی اصلاح کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ کتاب و سنت کے مقتضیٰ پر چلو[77]۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسے استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ تعمیری مقاصد کے لئے اسے استعمال کرنے کا حکم اور ترغیب آئی ہے۔ نبی

کریم ﷺ کو تمام انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ علم و عقل سے نوازا ہے۔ اس لئے عقل ہی کا تقاضا ہے کہ تمام انسان اپنی اپنی عقل کو آپ ﷺ کے لائے ہوئے تعلیمات کے تابع سمجھے۔ اس لئے کہ رسول ﷺ مطاع ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔ قرآن میں ارشاد فرمایا:

أَطِيْعُواْ اللهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ[78] "اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔"

گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے۔ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان منافقین کی مذمت کی ہے جو اپنی غرض پرستی اور منافقت کی وجہ سے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت میں کوتاہی کرتے تھے۔ ارشاد فرمایا:

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودا[79]

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کتاب کی طرف جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اور اس کی طرف تو اے رسول! تو دیکھے گا ان منافقوں کو کہ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں تیری طرف سے۔"

اس آیت میں "ما انزل الله "یعنی کتاب اللہ کی طرف بلانے کے ساتھ رسول ﷺ کی طرف بلانے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ اطاعتِ رسول کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت کرو بلکہ رسول ﷺ کی اطاعت اس سے الگ اور مستقل چیز ہے۔

خلاصہ بحث

الغرض خواجہ صاحب کی تفسیر بیان للناس فکر، اسلوب منفرد اصول تفسیر اور تفردات کی بناء پر عام تفسیری لٹریچر سے بہت منفرد اور مختلف ہے، جس پر جدیدیت اور تجدد کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ اصول تفسیر میں تفردات کے نتیجے میں نفس تفسیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

حواشی وحوالہ جات

1 ماہنامہ بلاغ امرتسر، خواجہ نمبر ۱۳، جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ / ستمبر ۱۹۳۶ء نمبر ۹، ادارہ تحریر امرتسر، بھارت۔۔۔ ڈاکٹر حافظ فیوض الرحمٰن، معاصرین: ۱۱۰- ۱۱۲ اقبال نیشنل بک سروس، لاہور، بار اولیٰ ۱۹۹۳ء

2 سورۃ النساء ۴ : ۱۰۵

3 سلیمان بن الاشعث السجستانی، سنن ابو داؤد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ، حدیث(۱۱۸۰) مترجم علامہ وحید الدین، اسلامی اکادمی اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء

4 السیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن ۲: ۱۷۵- ۱۷۶

5 صوفی غلام مصطفی تبسم، تعارف بیان للناس: ۳-۵

6 محمد حسین عرشی امرتسری، سر آغاز، تفسیر بیان للناس ۱: ۲

7 سر سید احمد خان، تحریر فی اُصول: ۱۹-۲۱

8 نفس مصدر: ۳۵

9 نفس مصدر ۲:۲۶۳

10 نفس مصدر ۵: ۲۰

11 سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۷۹

12 خواجہ احمد الدین امرتسری، تفسیر بیان للناس ۴: ۲۴۶، دوست ایسوسی ایٹس لاہور، ۱۹۹۱ء

13 نفس مصدر

14 نفس مصدر ۵: ۷۸

15 نفس مصدر ۱:۱۵۵

16 سورۃ النحل ۱۶: ۴۴

17 بیان للناس ۱:۱۶۳

18 سنن ابو داؤد (مترجم اردو) کتاب السنہ ۳: ۵۱۸، حدیث (۱۳۴۰) اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۳ء

19 بیان للناس ۱:۲۰۳

20 سورۃ البقرہ ۲ : ۶۵

21 بیان للناس ۱: ۲۰۴- ۲۰۵

22 نفس مصدر: ۳۰۳

23 سورہ الحج ۲۲ : ۳۰

24 بیان للناس ۱: ۲۸۴

25 نفس مصدر ۴: ۱۴۰

26 نفس مصدر ۴: ۲۵۱

27 نفس مصدر ۵:۶۸

28 نفس مصدر ۴:۲۴۶

29 نفس مصدر ۳: ۱۶۳– ۱۶۴

30 نفس مصدر ۲: ۱۷۰

31 سورۃ الانعام ۶ : ۱۱۶

32 بیان للناس ۳: ۲۲۴

33 سورۃ النساء ۴: ۴۳

34 ابن کثیر، حافظ عماد الدین، تفسیر ابن کثیر ا: ۵۰۰، مطبعۃ مصطفی محمد، ۱۳۵۶ھ

35 بیان للناس ۴: ۷۷

36 نفس مصدر ۶: ۳۳۶– ۳۳۷

37 نفس مصدر ۶: ۳۴۹

38 نفس مصدر ۶: ۳۵۱

39 نفس مصدر ۷: ۱۰۷

40 سورۃ الجمعہ ۶۲ : ۱۱

41 نفس مصدر

42 بیان للناس ۷: ۱۱۰

43 نفس مصدر ۷: ۱۵۳

44 بیان للناس ۷: ۱۶۹–۱۷۰

45 نفس مصدر: ۱۷۳– ۱۷۴

46 بیان للناس ۷: ۲۳۳

47 نفس مصدر ۷: ۲۵۴

48 بیان للناس ۷: ۲۵۹

49 نفس مصدر ۷: ۲۷۰– ۲۷۱

50 بیان للناس ا: ۲۷۱

51 نفس مصدر ا: ۳۷۳– ۳۷۴

52 بیان للناس ۲: ۱۶۸– ۱۶۹

53 نفس مصدر ۳: ۳۰

54 بیان للناس ۴: ۷۱

55 نفس مصدر ۴: ۷۲

56 بیان للناس ۴: ۷۶

57 سورۃ المائدہ ۵ :۱

58 سورۃ ھود ۱۱: ۱۰۷۔۔۔ سورۃ البروج ۸۵: ۱۶

59 سورۃ الاعراف ۷:۲۸

60 ایضاً ۴: ۱۷۷

61 ایضاً ۴: ۱۷۷

62 بیان للناس ۷: ۲۷۷

63 بلاغ، امرتسر، خواجہ نمبر: ۷۹

64 سورۃ المائدہ ۵ : ۳

65 بلاغ، امرتسر، خواجہ نمبر:۲۷

66 نفس مصدر ۵: ۱۹۶

67 نفس مصدر ۴:۴۲

68 امام راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ وحی:۸۵۸، دار ارقم دمشق / دارالشامیہ بیروت، طبع الرابعہ ۱۴۳۰ھ، ۲۰۰۹ء

69 علامہ بدر الدین عینی ، عمدہ القاری ،شرح صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب ۱، دار الکتب بیروت ۱۴۲۱ھ /۲۰۰۱ء

70 سورۃ النحل ۱۶:۴۴

71 سورۃ البقرہ ۲: ۱۲۹

72 حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر ۱: ۲۱۰، نور محمد کارخانہ کتب وتجارت کراچی، (س۔ن)

73 امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن ۱: ۳۵۳- ۳۵۴، فاران فاؤنڈیشن ۱۹۹۰ء

74 سورۃ البقرہ ۲: ۱۹۱

75 تفسیر ابن کثیر ۱: ۲۲۵

76 سورۃ البقرۃ ۲: ۲۳۱

77 کاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن ۱: ۴۴۳، قرآن محل، اُردو بازار لاہور، طبع اول:۲۰۰۶ء

القرآن الکریم، النساء:۵۹، النور:۵۴

79 سورۃ النساء ۴ : ۶۱